



## ادبیات مشرق و مغرب پر

# مولانا روم کا اثر

روفیسر ڈاکٹر ایناماری شیمیل، یونیورسٹی، بون، مندرجہ ذیل ڈاکٹر مدرسہ رینس

ان کے ایک نہایت معروف شاعر مولانا جامی (متوفی ۸۹۸ ہجری) نے مولانا روم (م۔ ۷۲۰ھ) سے  
میں فرمایا ہے:

من چہ گویم وصف آن عالی جناب نیت پیغمبر ولی دار کتاب  
ظ" کتاب" سے مثنوی معنوی کی طرف اشارہ ہے۔ دنیا کے بے شمار افراد مثنوی کو ایک متنبک  
تھے ہیں جیسا کہ اس مشہور مصرعے میں مذکور ہے: "ہست قرآن در زبان پہلوی۔ عہ  
نثوی شریف حقیقت میں ایک بحر معراج ہے جس میں مختلف رنگ کی قالین نما موجیں ابھرتی نظر  
سات سو سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا کہ یہ کتاب صوفیہ اور جہان عشق کے دلہا ختوں کے دلوں  
ریں اور قوت القلوب کا مقام رکھتی ہے۔ دوسری طرف رومی کا دیوان غزلیات، معروف بہ دیوان  
بریزی" پوری دنیا میں مشرق سے مغرب تک مشہور اور عشق الہی اور حسرت بے انتہا کے جذبات  
کامل ہے۔ ۳

مولانا روم نے اپنی باسعادت زندگی کا بیشتر حصہ سلاجقہ روم کے دار الحکومت قونیا میں  
روہیں ۱۲۷۳ء میں دعوتِ واپسین کو لے لیا اور دار الفنا سے دار البقا کو سدھارے۔ آپ

بوع دو ماہی "معارف اسلامی" تہران اگست ۱۹۶۷ء

ANNE MARIE SCHIMMEL

ان تیس تیر مزی کے صحیح ترجموں کو یہ و فیہ بدیع الزمان فریوز الغزالی نے دس جلدوں میں تہران سے شائع

یہ ہے (مترجم) عہ یہ سراسر شاعری اور مبالغہ ہے۔ مدبر

رخِ صَدْرِ اب بھی زیارت گاہ اور بلادِ روم کا ایک روحانی مرکز ہے۔

حس طرح مولانا کے شعر و فکر نے سلاجقہ روم کی ادبیات اور تمدن کو متاثر کیا، اسی طرح ان کے طریقہ مولوی نے ترکی کی کلاسیکی موسیقی پر لازوال اثرات چھوڑے اسی طرح ترکی ادبیات اور فنون لطیفہ میں بھی مولانا اور ان کے مریدوں کی مساعی کی صدا گونج رہی ہے۔ قونیہ کے سجادہ نشین عثمانی بادشاہوں کی تخت نشینی کے وقت ان کو شمشیر پیش کرتے اور ان کی حمایت سے سلطان کو ایک طرح کی فوجی مدد حاصل رہتی تھی۔

مولانا کی زبان فارسی تھی اور ترکوں کے لئے اس کا سمجھنا مشکل تھا۔ چنانچہ مشنوی کے تراجم اور شروع کی کئی اور پہلی مترجح سلطان ولد کے زمانے میں لکھی گئی۔ یہاں ہم مختصراً صرف دو معروف کتابوں کا ذکر کریں گے۔ ایک "مترجح آنقرہ لی اسمعیل دیسوقی" ہے جو مشنوی کی بہترین مترجح مانی جاتی اور سترھویں صدی عیسوی کے اوائل میں لکھی گئی ہے۔ دوسرا ترکی زبان میں مشنوی مترجح کا منظوم ترجمہ ہے جسے سلیمان ہنہنی (۱۸۰۰-۱۸۶۰ء) نے اسی بحر و وزن میں مکمل کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں عبدالباقی کولنیاری صاحب کی تحقیقات و تحقیقات قابل ذکر ہیں۔ فاضل موصوف نے دیوان شمس تبریزی (دیوان کبیر) کو ترکی نثر میں با محاورہ ترجمہ کر دیا ہے۔ پروفیسر طریکاھیا اور آنقرہ کالج کے ان کے شاگردوں نے بھی تراجم اور تحقیقات میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

پانچ سال قبل قونیہ میں ایک مختصر مگر جامع رسالہ مولانا کے روم کے ادبیات ترکی پر اثرات کے بارے میں چھپا ہے۔ قونیہ کے مولوی عجائب گھر کے ناظم اعلیٰ محمد اوند نے اشعار ترکی کا ایک انتخاب شائع کروایا ہے، جس میں پہلا شعر چودھویں صدی عیسوی کے کسی شاعر کا ہے۔ اُس زمانے میں ترکی شاعری کے ایک منقذ شاعر "گل سبزی" نامی نے مولانا کے روم کی تعریف میں ایک غزل کہی ہے۔ یہ روش بعد میں چلتی رہی۔ موجودہ زمانے تک کتنے ہی اعلیٰ و ادنیٰ ترک شعراء نے مولانا روم کی شان میں قصائد لکھے اور ان کی روح پرفسح سے فیض حاصل کیا ہے۔

مولانا کے روم کے صاحبزادے سلیمان ولد کی مشنوی ولد کی یا ولد نامہ مولانا نے روم اور دوسرے سونیا کے دور میں پیش اور عارفانہ شعر کا کمال سمجھی جاتی ہے۔ سلطان ولد کا وصال ۱۲۰۰ھ میں ہوا ہے (۱۷۸۵ء)۔

معاصر ترکی کے ایک عظیم شاعر اور ادیب "یجی کمال" نے ایک جگہ کہا ہے: 'ہم روز محشر تک مولانا کے روم کے ہم نفس رہیں گے'۔ کئی صدیوں اور دوسروں نے اپنی تالیفات میں مولانا کو اپنا دستگیر و روحانی پیشوا قرار دیا ہے۔ انھوں نے مولانا کے اسرارِ سماع کو جدید طریقے سے مترجم کیا ہے۔ مولانا کے طریقہ مولویہ کی رسمِ سماع نے مشرق و مغرب کے ناظرین اور سیاحوں کی توجہ کو قرون وسطیٰ سے اپنی طرف مبذول کئے رکھا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ سماع کا یہ طریقہ مولویہ گروہ کا خاصہ نہیں ہے۔ یہ قدیم زمانے سے مختلف غیر متمدن اقوام اور عالمگیر مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان بھی معمول رہا ہے۔ قدیم یونانی فلاسفہ نے ستاروں اور آفتاب کی حرکت میں ایک خاص قسم کی کیفیتِ سماع کو محسوس کیا ہے۔ بلا عرب کے مسیحی ماہرینِ صنعت نے سماع سماوی کو خاص قسم کی صورت سے واضح کیا ہے اور ان صورتوں پر توجہ کے پر تو کی ادبیت، الہیات، فلسفہ اور فنونِ لطیفہ میں موجودگی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے لیکن مولویہ فرقہ کے عاملین کے ہاں ان تمام قدیم افکار و رجحانات کو ایک منظم طریقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ مولانا نے فرمایا ہے:

معشوق چو آفتاب تباہاں گردد عاشق بہ مثال ذرہ گردان گردد

چون باد بہار عشق جنباں گردد ہر شاخ کہ خشک نیست رقصاں گردد

یعنی رقصِ افلاک، انسان کے کرہ ارض کے مرکزِ ثقل سے نکل جانے اور ذروں کا سورج کے گردا گرد رقص

کرنے کا لازمہ، عاشق کا انائے مطلق الہی سے وصال حاصل کرنا ہے۔

یورپ کے جن لوگوں کو حکومت عثمانی کی قلمرو میں داخل اور سماع مولویہ کے دیدار سے بہرہ مند ہونے

کا موقع ملا۔ وہ انگنت بدنما ہوئے ہیں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے دو انگلستانوں کلاک اور پائلس

نے اس سماع کی خوب توصیف کی ہے اور ابھی تک مسیحیوں میں سماع درویشاں ایک عام عبادت ہے اگرچہ وہ

لوگ سماع کے حقیقی مفہوم سے ناواقف ہیں۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر تک مشنوی معنوی کے مطالب کا شہرہ دہار فرنگ میں نہ پہنچا تھا۔

اس صدی میں پہلی بار ترکی میں متعین ایک فرانسیسی افسر جے۔ ڈے۔ والبنرگ نے مشنوی کو مکمل طور پر

فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرایا تھا مگر یہ قیمتی سرمایہ ۱۷۶۶ء میں استنبول میں آتش زنی کی واردات میں

میل کر خاکستر ہو گیا۔ اس طرح ایک سو سال بعد ہی مثنوی کا ترجمہ اہل یورپ کو میسر ہو سکا۔ ۱۸۱۸ء میں مشہور  
 مستشرق ہیمبرگ پگسٹال نے تاریخ ادبیات ایران، تالیف کی اور اس میں مولانا کے روم پر خاصی مبسوط بحث  
 لے ہے (یہ وہی شخص ہے جس نے دیوان حافظ کا جرمنی میں ترجمہ کیا۔ اور اسی کو پڑھ کر جرمنی کے مشہور شاعر  
 گوٹے نے خواجہ سے الہام لیا اور اپنے ”دیوان شرق و غرب“ کو وجود میں لایا ہے)۔ ہیمبرگ پگسٹال مثنوی  
 کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے: ”یہ کتاب دریائے گنگا کے کنارے سے لے کر سیفر بوغز کی بغل  
 تک ہر کہیں عارفوں کا سرمایہ الہام ہے“۔ مؤلف مثنوی کے بارے میں ہی اس بیان پر اکتفا نہیں کرتا، وہ  
 ”دیوان شمس تبریزی“ کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتا ہے: ”..... مولانا اس کتاب میں ایسے مطالب بیان  
 فرماتے ہیں جو ادیان کی ظاہری حالت سے ماوراء ہیں۔ وہ عشق و محبت کے بال و پر کے ذریعے اس مقام تک پرواز  
 کرتے ہیں جہاں ذات مجرد اور نور سردی کے انوار کی بارش ہے۔ مولانا کے روم ماہ و آفتاب سے گزر جانے  
 پر ہی اکتفا نہیں کرتے۔ وہ زمان و مکان، خلق و تقدیر، عہد الست اور یوم نشور سے گزرتے ہوئے حقیقت  
 لامتناہی تک جا پہنچتے ہیں۔ یہاں عابدانہی و ابدی ذات سردی سے جا ملتا ہے اور عاشق نامتناہی معشوق  
 لم یزالی سے جا ملتا ہے۔“

ہیمبرگ پگسٹال نے مثنوی اور دیوان شمس تبریزی کے منتخبات کا ترجمہ کیا ہے اس کے تراجم ناقص اور  
 اصل متن کی تاثیر کے عکاس نہیں ہیں مگر بعض حصے خاصے دلآویز ہیں۔ دیوان حافظ کا جو ترجمہ ہمیر نے  
 کیا ہے اس کے اثرات تو گوٹے کی تصانیف میں دیکھے جاسکتے ہیں لیکن گوٹے نے مولانا کے روم سے متاثر نہ  
 ہوا۔ بلکہ اپنے دیوان غربی و شرقی کے حاشیے میں مولانا کے خلاف لکھتا ہے۔ گوٹے اپنے غیر منطقی بجا افکار میں  
 عرق رہا۔ وہ بعض یورپی افکار کو بغیر سوچے سمجھے مجاز و رموز کے پیرائے میں بیان کرتا رہا۔ بہر طور ۱۸۱۹ء۔  
 ۱۸۲۱ء کے درمیان مولانا کے روم کے نام نے جرمنی میں ایک تازہ شہرت حاصل کی۔ لٹرس کے چرچ تھلاک  
 کے ایک شخص پوپ نے ۱۸۲۱ء میں لاطینی زبان میں ایک مختصر رسالہ لکھا اور اس میں مولانا کے روم کے فکر و فلسفہ  
 اور عرفان سے بحث کی ہے۔ یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک جرمن عالم کے قلم سے اپنی قسم کا پہلا رسالہ تھا۔  
 اس رسالے میں مؤلف نے مولانا سے وحدت الوجود کی تعلیم منسوب کی اور بعد کے متعدد لکھنے والوں نے ہم

ان کے ہاں نوافلاطونی افکار کے پر تو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی سال ۱۸۲۱ء میں ایک جرمن مستشرق فریدرچ روکرٹ نے مہم غزلیات پر مشتمل ایک مجموعہ شائع کیا۔ یورپ میں غزل سرائی کی تاریخ میں یہ پہلا ادبی نمونہ تھا۔ روکرٹ نے فی الواقع بہت موثر اور دلآویز شعر کہے ہیں۔ یہ مختصر مجموعہ بعد کے شعراء کے کلام پر اثر انداز رہا اور ایک مخصوص ادبی طرز بن گیا۔ روکرٹ کی غزلیں مولاناؒ روم کی غزلوں کا ترجمہ نہیں ہیں لیکن اتنا واضح ہے کہ ہمیں پرگٹال کی تاریخ ادبیات ایران اور مولاناؒ روم کے کلام کے تراجم کا اس نے اثر قبول کیا ہے۔ روکرٹ نے ان مطالب کو نئے انداز میں ڈھالا۔ مگر یہ غزلیں مولاناؒ روم کی غزلیات اور ان کی شخصیت کا تعارف کراتی ہیں۔ روکرٹ بھی گویا مولاناؒ روم کی مانند شمس تبریزی کی شخصیت میں کھو گیا اور یہ غزلیات اس کیفیت کی آئینہ دار ہیں۔ جرمنی زبان میں اس کے بعد فلسفہ اور الہیات کی جن کتابوں میں بھی اسلامی تصوف یا رومی سے بحث کی گئی، روکرٹ کی ان غزلیات سے ہی استشہاد کیا گیا اور شاید اب تک رومی کے عشق اور حسرت نام تمام کی جرمنی زبان میں کسی نے بھی اس سے بہتر ترجمانی نہیں کی ہے جیسا کہ اشارہ کیا گیا، یہ حقیقی ترجمہ نہیں ہے۔ پھر بھی اتنا متداول ہے کہ ۱۹۰۳ء میں اسی کی بنا پر مولانا کے اشعار کا انگریزی ترجمہ بھی عمل میں آیا ہے۔ روکرٹ کے بعد دوسرے مستشرقین نے بھی کوشش کی کہ مولانا کی تصانیف کا جرمنی میں ترجمہ کر دیں۔ ۱۸۳۸ء میں روزن وگ شوالڈ نے دیوان شمس تبریزی (دیوان غزلیات مولانا رومی) کا ایک انتخاب جرمنی زبان میں ترجمہ کیا اور اگرچہ یہ ترجمہ روکرٹ کے ترجمے کے مقابلے میں اصل متن سے قریب تر تھا، مگر اسے وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی۔ ۱۸۴۹ء میں روکرٹ نے مثنوی کے دو دفتر جرمن زبان میں منظوم ترجمے کئے۔ اور ۱۸۸۰ء میں وہن فیلڈ اور ریڈ ہاؤس بھی مثنوی کا ترجمہ کرنے میں لگ گئے۔

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں مولاناؒ روم اپنی تصانیف کے انگریزی اور جرمنی تراجم کی بنا پر سارے یورپ میں ایک بڑے صوفی اور وحدت الوجود کے نمائندے کے طور پر مشہور ہوئے۔ آٹھ، کی نظر میں وہ سارے جہاں میں وحدت الوجود کے سب سے بڑے داعی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا تاریخ

ROZENZWEIG SCHWANNAU ۱۲ FRIEDRICH RUCHERT ۱۳

REDHOUSE ۱۴ WHINFIELD ۱۵

۱۶ مراد DR HERMAN ETHE سے ہے (مترجم)۔ ۱۷ PANTHEISM

یات عالم میں اپنی قوت فکر اور لطیف نکتہ آفرینی کی بنا پر دائمی شہرت کے سزاوار ہیں۔ اگر کہا جائے کہ آریے سن نے مولانا نے روم کے سلسلے میں یورپ میں سب سے اہم خدمات انجام دی ہیں، تو یہ کوئی مبالغہ آمیز مانہیں ہوگا۔ نکلسن نے اپنی ابتدائی و انتہائی علمی و ادبی تحقیقات کو عموماً تصوف اور خصوصاً مولانا نے روم پر مرکوز رکھا۔ ۱۸۹۸ء میں انھوں نے 'دیوان شمس تبریزی' کی منتخب غزلیات کو شائع کر دیا۔ لیکن ہے کہ ان کے ایک دو نظریات سے آج اتفاق نہ کیا جائے۔ مثلاً نو افلاطونیوں کے افکار جو اس وقت پر معمولی مروج تھے، مگر عام طور پر نکلسن کا ترجمہ اور حواشی افادات سے خالی نہیں ہیں۔ اس مستشرق کا سلسلے میں سب سے بڑا شاہکار مثنوی معنوی کا کئی قدیم مخطوطوں سے مقابلہ کر کے چھپوانا اور اسے انگریزی میں ترجمہ اور شرح کرنا ہے۔ وہ مدتوں مثنوی کے مطالعہ اور درک مطالعہ سے محظوظ رہا۔ اور مغرب مشرق کے فضلاء کی خاطر اس کے تحقیقی کام کی اہمیت واضح ہے۔ جتنا ممکن تھا اس نے لغوی اور معنوی اشکالات کو بھی حل کیا ہے۔ تصحیح و ترجمہ کے علاوہ نکلسن نے مولانا کی تصانیف کے انتخابات "بھی مرتب کئے۔ مثنوی کی حکایات، ابیات اور غزلیات کو انگریزی نظم اور نثر میں ترجمہ کیا۔ اور ان کوششوں سے مولانا کے عشق کے اس مشعل بردار مستشرق نے رومی کو انگلستان اور امریکہ میں خوب روشناس کرایا ہے۔

نکلسن کے بعد اس کے جانشین اور کیمبرج یونیورسٹی کے استاد اے۔ جے آر بری نے حیرت انگیز تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا، اور مولانا کی گفتار کے بہت سے تراجم شائع کروائے ہیں مثلاً "فیہ ماقبہ" رباعیات اور منتخب حکایات۔ آر بری نے راقم الحروف کو بتایا کہ وہ باقی عمر بھی ایسی تحقیقات کرتے رہیں گے اس لئے کہ رومی کے اشعار سے روح کو غیر معمولی معنوی تسکین ملتی ہے۔

جرمنی میں ایچ ریہر کے علمائے مقالات کا ذکر ضروری ہے۔ انھوں نے استنبول اور قونیہ کے کتب خانوں سے رومی کی کتب کے مخطوطات پر اور مولانا کی اولاد کے بارے میں تحقیقات کی ہیں اور رومی کے سماع کے بارے میں ایک مفید اور جامع مقالہ لکھا ہے۔

علماء اور مستشرقین کے علاوہ بہت سے یورپی شعراء نے بھی رومی کی رموز اور اصطلاحات سے

۱۷ R. A. NICHOLSON

۱۸ SELECTED POEMS OF THE DIWAN-I SHAMS-I TABRIZ

دلچسپی ظاہر کی ہے۔ مولانا کی بعض تشبیہات مثلاً ان کی "حسرت زدہ نئے" جو رمز سماع کے طور پر استعمال ہوتی ہے، جرمنی، انگریزی اور فرانسیسی ادبیات میں مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ لیکن جن شعراء نے رومی کی تقلید کی ہے، تعداد میں زیادہ مہنیں ہیں۔ کم از کم گوٹے کے تحت تاثیر حافظ کی تقلید کرنے والے شعراء کے مقابلے میں مولوی کی روش پر چلنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔

یہاں ایک سن رسیدہ شاعر کا ذکر کر دیا جائے جو برلن میں مقیم ہے۔ یہ شاعر مولانا کا عاشق ہے۔ اس کے عشق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ چند سال قبل بہانے کر کے وہ روسی علاقے سے بھاگ نکلا اور سیدھا قونیہ جا پہنچا۔ اس شاعر نے ۳۰ سال قبل مولانا کی تعلیمات سے متاثر ہو کر سو آبدار غزلیں کہی تھیں۔ اس شاعر کا نام ہینز منگے ہے اور فارسی زبان سے نابلد ہے۔ یہاں میں اپنی کتاب کا ذکر بھی کر دوں۔ میں نے بھی مولانا رومی کی تقلید و پیروی میں غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے۔ مستشرقین کی مساعی اور مولانا کے اشعار کے اتنے متنوع کے باوجود یورپ میں ان کا نام عمر خیام، شیخ سعدی شیرازی یا خواجہ حافظ کے برابر مشہور نہیں ہو سکا اس لئے ان کے حقیقت آمیز ملبند افکار کی تاثیر کی خاطر ہمیں مزید مشرق کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

ایران میں مشنوی معنوی کی صد ہا ستر میں لکھی گئی ہیں جن کی توضیح کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ قرون گزشتہ سے لیکر اب تک ایرانی فضلاء مولانا کے آثار و افکار کی نشرو اشاعت میں مصروف رہے اور موجودہ زمانے میں اس کا کامل نمونہ پروفیسر بدیع الزمان فروز افروز کی تحقیقات و تدقیقات میں دیکھا جاسکتا ہے اور تمام مستشرق اور مولانا کے دوسرے دلدادگان اس معاصر محقق اور فاضل استاد کی خدمات کے سپاس گزار ہیں۔<sup>۱۲</sup> عرب ممالک میں مولانا نے رومی کے افکار کی تاثیر معمولی اور جزوی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل شیخ

نٹے HANNS MEINKE لٹے چونکہ مقالہ نگار کے مخاطب ایرانی تھے۔ (مترجم)

لٹے پروفیسر فروز افروز نے دیوان شمس تبریزی کو ایڈٹ کرنے کے علاوہ نینہ مافیہ، نیز مولانا کے والد مہاؤالدین (م ۶۳۸ھ) اور ان کے صاحبزادے سلطان ولد کی تصانیف کو شائع کروایا ہے۔ زندگی مولانا نے رومی مولوی، مآخذ مشنوی، حکایات مشنوی اور مترجم مشنوی مترجم، جس کی ۳ جلدیں چھپ چکی ہیں، ان کی معروف تالیفات ہیں۔ علی رشتی صاحب نے ان ہی کے ایما پر سیرے در شمس تبریزی لکھی اور شائع کی ہے۔

یوسف بن احمد المرسوی نے ”المنہج القوی لطلاب المثنوی یا فی شرح المثنوی“ کے عنوان سے ایک کتب لکھی تھی جو قاہرہ میں چھپ چکی ہے مگر قرون وسطیٰ میں مولانا کے افکار و نظریات ممالک عرب میں مجموعی طور پر نامعلوم ہی رہے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہراً یہ ہے کہ فارسی شعر اور عربی تصوف میں توافق نہیں ہے۔ اور اسی لئے زبان پہلوی کا یہ قرآن متضاد نظریات کے حامل افراد کے ہاں رواج نہیں پاسکا ہے۔

۱۳۳۶ ہجری شمسی میں عبدالعزیز جو اہر کلام نے مثنوی کا عربی میں منظوم ترجمہ تہران سے شائع کیا ہے۔ مرحوم عبدالوہاب عزام نے جو پاکستان میں (متحدہ عرب جمہوریہ کے) سفیر تھے۔ اور ڈاکٹر محمد اقبال کی بعض تصانیف کو عربی میں منتقل کر چکے ہیں، انہوں نے مولانا کے روم کے بعض اشعار کو بھی عربی میں منتقل کیا ہے مگر اعتراض کرنا چاہئے کہ رومی کا دوسرا روحانی وطن برصغیر ہندو پاکستان ہی ہے۔

مولوی معنوی کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد ان کی پوری مثنوی کو مشرقی بنگال والے پڑھنے لگے تھے یہاں تک کہ وہاں کے ہندو اور برہمن بھی اس کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اور بنگال کے ہندو کے اشعار میں بھی مولانا کی ”حسرت زائے“ کی عدلے بازگشت ملتی ہے۔ بنگالی مثنوی کو اپنے ملی نغمات سے ہم آہنگ کر رہے تھے۔ اور بعد کے زمانے میں یہاں کے فضلاء نے مثنوی کے منظوم و منثور کئی ترجمے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان میں سے بعض تراجم ابھی تک چھپے نہیں اور مشرقی پاکستان کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مولانا کے رومی کے حالات زندگی مشرقی پاکستان کے پرائمری اسکولوں کے نصاب میں بھی شامل ہیں اور بچے بچے کے ورد زبان ہیں۔

برصغیر ہندو پاکستان کے صوفیاء ادب میں مثنوی معنوی کے اثرات کو معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگر برصغیر کے کتب خانوں کے مخطوطوں کی انگریزی، جرمنی یا فرانسیسی فہرست پر ایک نظر ڈالیں تو مثنوی کے ایسے ہزاروں نسخے نظر آتے ہیں جو اس دیار میں لکھے گئے ہیں۔ اس طرح مثنوی کی فارسی، اردو، بنگالی، پنجابی اور دوسری زبانوں میں متعدد مترجمین موجود ہیں۔ تاریخ میں برصغیر کے صوفیاء کی متعدد حکایات ان صوفیاء سے مولانا کے معنوی روابط کی حامل ہیں۔ مثلاً شیخ ابوعلی قلندر جو شیخ قطب الدین دہلوی کے مرید تھے، تو نبیہ تشریف لے گئے اور مولانا سے استفادہ کیا ہے۔ برصغیر کے صوفیاء کا ایک معتبر سلسلہ چشتیہ ہے جس میں مثنوی کا درس و مطالعہ لوازمات میں شامل ہے۔

”خیر المجالس“ حضرت چراغ دہلوی کے ملفوظات و فرمودات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں پہلی بار مولانا کے روم کا ذکر ملتا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں سید جہانگیر اشرف سمنانی تو نبیہ گئے اور سلطان ولد سے ان



اور مولانا نے روم کے حالات معلوم کئے اور یہ بات "لطائف اشرفی" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے ہم عصر  
برگزشتہ (۴۰ - ۷۹۰ھ) نے مولانا کی منقبت میں ایک نصیذہ لکھا ہے۔

مولانا نے روم اور شمس تبریز برصغیر کے عوامی ادب میں بھی عشق الہی کے رموز سمجھے جاتے ہیں اور شمس  
بکے نام کو سندھ اور پنجاب کے صوبوں کی ادبیات خصوصاً لوک ادب میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مولانا نے روم کی محبت برصغیر کے عوام اور خواص کا خاصہ رہا ہے۔ اکبر شہنشاہِ اعظم کو مثنوی بہت  
رہتی اور اکثر اسے سنا کرتا تھا۔ اس کے پوتے شہنشاہ شاہجہان نے ایک مجرم شاعر کو صرف اس لئے معاف کر  
نا کہ اس نے اپنی تقصیر کی معافی کی خاطر مولانا کی ایک رباعی کو مترنم آواز میں پڑھا تھا۔

داراشکوہ خود مسلک عرفان کا ساک تھا۔ اس نے سلطان ولد کی مثنوی ولد نامہ کو اپنے ہاتھ سے لکھا  
، اور وہ مخطوط ابھی موجود ہے۔ داراشکوہ مثنوی کا عاشق تھا۔ اور اس کا بظاہر خشک اور زاہد بھائی  
شاہ اورنگ زیب بھی جیسا کہ کئی مورخین نے لکھا ہے۔ خوش الحان مثنوی خوانوں کی محفل میں جاتا اور مولانا  
شعرا سے کر زار و قطار روتا تھا۔ مورخین نے ایسے لوگوں کے نام بھی تحریر کئے ہیں، جو خاص اہتمام اور حسن  
بشنوی پڑھا کرتے تھے۔

اس وقت کے سندھ کے دارالحکومت ٹھٹھہ کے باشندوں پر مولانا کے خاص اثرات نظر آتے ہیں۔  
صوفی شاعر جہانگیر ہاشمی ہے جس کی پدری اور مادری نسبت بالترتیب میر قاسم اور سید نعمت اللہ ولی کرمانی  
ملتی ہے وہ سندھ میں سلطان حسن ارغون کے دربار سے وابستہ رہے اور وہیں ۱۵۳۰ء میں فوت ہوئے  
مختصر مثنوی "مظہر الآثار" کے ایک باب کا عنوان ہے: "اس صوفی ذاکر کی کہانی جس نے اپنے شیطان کو  
کی صورت میں دیکھ لیا اور کہا: مدتوں سے اللہ اکبر کہہ رہے ہو ایک بار بھی لبتیک نہیں سنتے۔" اس کے بعد  
ماروم کی مشہور منظوم حکایت نعل کی گئی ہے جس کا ماہی حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی آرزو کے مطابق دعا  
کرتا۔ اس کی دعا خدائے تعالیٰ کے خطاب کا جواب ہوتی ہے۔ اس بات نے یورپ کے علماء پر بھی اثر ڈالا  
سب چاہتے ہیں کہ وہ ایسی مفید دعا کریں جس کی جناب خداوندی سے صد بار لبتیک فرمائی گئی ہو۔

بہر حال تاریخ ادبیات سندھ میں ایسے کئی معتقدانِ مثنوی کا ذکر ملتا ہے جو مولانا سے غیر معمولی شغف

رکھتے اور مثنوی شریف کو مؤثر اور حزمی لے ہیں پڑھتے اور سامعین پر رقت طاری کر دیتے تھے۔

مولانا کا سلسلہ مولویہ تو برصغیر میں مروج نہ ہو سکا لیکن مولانا اور مثنوی کا عشق سب طریقوں چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ کا خاصہ رہا ہے۔ نقشبندی سلسلے کے ایک بزرگ محمد زمان اول ہیں، انہوں نے اپنا پورا کتاب خانہ دوسروں کے حوالے کر دیا، اور اپنے لئے قرآن مجید کے علاوہ مثنوی اور دیوان حافظ کا ایک ایک نسخہ پاس رکھا۔ مولانا کے اثرات ایک اور بڑے صوفی پر دیکھے جاسکتے ہیں وہ شاہ عبداللطیف بھٹائی ہیں، جن کا انتقال ۱۷۶۷ء میں ہوا ہے۔ یہ عظیم صوفی اور سندھی زبان کے پہلے صاحب دیوان نامور شاعر مولانا کے محبوں میں شامل تھے۔ جن مؤلفین اور محققین نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے احوال و افکار پر کتابیں یا مقالات لکھے مثلاً ٹی. ایچ. سورلے، سب نے اپنے اوپر مثنوی کے اثرات کا ذکر بھی کیا ہے۔ ایک مصنف لکھتا ہے: "سندھ کے سلطان نے مثنوی مولانا کے روم کا ایک نفیس اور مزین نسخہ شاہ بھٹائی کی خدمت میں بھیجا، اور اس طرح ان سے دوری کی وجہ سے فیضان میں جو کمی محسوس ہو رہی تھی، اس کی تلافی کرنی۔ ان مؤلفین نے البتہ مثنوی کے اثرات کا گہرا مطالعہ نہیں کیا اور ظاہری افادات کا ذکر کیا ہے۔ شاہ عبداللطیف کے دیوان "شاہ جو رسالو" میں مثنوی کے زیر اثر کئی تشبیہات اور نمثیلات موجود ہیں مثلاً رموز نے، ہاتھی اور اندھوں کی حکایت جس میں وہ فرماتے ہیں:

آب کم جو، تشنگی آور بدست      تا بجزو شد آبت از بالا و پست

اگر پانی کی تلاش میں ہیں تو پانی ان کی تلاش میں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ صرف انسان ہی خدا کی جستجو نہ کرنا خود خدا بھی انسان کی تلاش میں ہنہ ناکہ اسے ہدایت کا آب حیات پلائے، اور راہ راست پر آجانے۔ اس کی روحانی تشنگی دور ہو سکے۔ شاہ عبداللطیف نے اپنے رسالے کے ایک باب میں مولانا کے روم بعض رموز کی طرف اشارے کئے ہیں۔ فرماتے ہیں: "طالب بہت ہیں اور جمال کا چشمہ وہی ہے۔" یہ رومی بات ہے "پہلے خود کو غائب کرنا اور پھر معشوق کی طرف آنا۔" یہ بھی رومی کی گفتار ہی کا پر تو ہے۔ چونکہ شاہ بھٹائی کے اشعار اور فرمودات وادی سندھ کے خواص و عوام کی زبان پر جاری و ساری ہیں۔ اس لئے اذریعے سے مولانا کے روم کا فیضان بھی وہاں پہنچ گیا ہے۔ یہاں پر ایک دوسرے شاعر کا ذکر کر دیا جا

وہ بیدل روحی دار ہے۔ جس نے اپنی کتاب 'دلکشا' کے ہر باب میں قرآن مجید کی ایک آیت، ایک حدیث رسول، مثنوی کے ایک شعر اور شاہ عبداللطیف کے ایک قول سے اپنے بیان کو مستند کیا ہے اور اس طرح اپنی صوفیانہ نظم کے زوردار مطالب کو بیان کیا ہے۔

مثنوی شریف کی برصغیر میں فارسی یا اردو میں جو مشروح لکھی گئیں، وہ متعدد ہیں مگر ان میں دو بہت معروف ہیں۔ بوستان تالیف عبدالمجید پیل پیتی اور شرح بحر العلوم جو ۱۸۱۹ء میں لکھی گئی ہے۔ جس طرح ترکی زبان میں مثنوی کا ایک منظوم ترجمہ اسی بحر میں موجود ہے ایسے ہی منظوم ترجمے برصغیر ہندوپاک کی زبانوں میں بھی ملتے ہیں۔ سندھی زبان میں "اشرف العلوم" کے نام سے ایک منظوم ترجمہ دین محمد ادیب نے کیا جو بیس سال قبل چھپا تھا۔ ایک اور سندھی منظوم ترجمہ سے ہمیں آگاہی ہے مگر وہ ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔

پنجابی میں دو ترجمے اور شرحیں میں نے دیکھی ہیں۔ پختون میں ایک نام تمام منظوم ترجمہ پشاور یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ایک جدید اردو ترجمہ بھی مسودے کی صورت میں دیکھا ہے۔ البتہ مرحوم سیاب اکبر آبادی کا منظوم اردو ترجمہ کسی بار چھپا اور میری نظر سے گزرا ہے۔

گزشتہ ادوار میں جتنی شرحیں اور ترجمے کئے گئے۔ ان میں وحدت الوجود کا رنگ غالب ہے۔ اس سے ہمیں انکار نہیں کہ مثنوی میں ایسے انکار موجود ہیں جن میں ابن عربی کے انکار سے ہم آہنگی نظر آتی ہے لیکن مجموعی طور پر مثنوی ایک مختلف جہان معانی ہے۔ اس میں آیات قرآن مجید، احادیث رسول، قدیم صوفیاء، مثلاً امام محمد غزالی، حکیم سنائی اور عطار کے اقوال سے استہاد کیا گیا مگر وحدت آفرینی کے ساتھ۔ سچ تو یہ ہے کہ مثنوی کے بحر سبکراں سے ہر کوئی اپنی فکر اور حوصلے کے مطابق مطالب گیری کرتا، اشعار کا انتخاب کرتا اور ایک فکری و علمی نظام کی بنیاد رکھتا ہے۔ وحدت الوجود کا نظریہ تیرھویں صدی عیسوی میں چونکہ تصوف اسلامی کے اہم تر مطالب میں شامل تھا، اسی خاطر مثنوی کے مغربی و مشرقی شارحین نے اس کتاب کو اسی زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ اور اسی خاطر مرحوم علامہ محمد اقبال، پاکستان کے قومی شاعر بھی شروع شروع میں مولانا کے روم کے انکار میں وحدت الوجود کی تعلیم تلاش کرتے رہے ہیں۔ اقبال نے اپنا تحقیقی مقالہ "ایران میں فلسفہ طہراء الطبیعیۃ کا ارتقا" ۱۹۰۷ء میں ڈاکٹریٹ کے حصول کی خاطر میونخ یونیورسٹی میں پیش کیا اس میں وہ مولانا کے بارے میں کہتے ہیں: اس مکتب فراق کے امام اعظم روحی اعظم ہیں۔ آپ نے عالم کے قدیم

لونی تصور کو لے لیا جو ہستی کے مختلف دائروں میں کار فرما ہے۔ ان کی نظر میں ثنویت ایک ظاہری تخیلی، نواب یا ایک سایہ ہے۔" الخ۔ اقبال اس مطلب کے اثبات کی خاطر روح ناطقہ کا وہ تصور پیش کرتے دساری دنیا میں نمایاں ہے۔ یہ بات نوافلاطونی نظریات اور مولانا کے روم کے اشعار میں موجود ہے کہ

از جمادی مردم و نامی شدم و از نما مردم ز حیوان سر زدم  
مگر اپنی عمر کے آخری ایام میں اقبال نے ان ہی اشعار سے انسانی ارتقاء کے نظریے کی توثیق کی ہے ۱۹۰۸ء  
ورپ سے واپسی کے بعد انہیں احساس ہوا کہ نوافلاطونی وحدت الوجودی نظریہ مولانا کے روم کا ایک  
رنگ اور ان کی فکر کے عظیم تالین کا گویا ایک پارمینہ گوشہ ہے۔ میرا خیال ہے اقبال کے نظریہ میں اس  
پلی کے آجانے میں علامہ شبلی نعمانی کی "الیف" سوانح مولانا کے روم" کا بھی اثر ہوگا جو ۱۹۰۹ء میں چھپی  
۲۶ شبلی کتاب کے آخری حصے میں یورپی نظریہ ارتقاء پر بڑی مفکرانہ بحث کرتے اور متحدہ مثال کے  
بور کی مدد سے روشنی دالتے ہیں۔ وہ مولانا کے اشعار سے ایک ایسا روحانی ارتقاء پیش کرتے ہیں جس کی رو سے  
مان نہ صرف کمال کے نزدیک بلکہ ربوبیت کے ظل سے بہرہ مند ہونے لگتا ہے:

از جمادی مردم و نامی شدم و از نما مردم ، ز حیوان سر زدم

مردم از حیوانی و آدم شدم پس چہ ترسم ، کی ز مردن کم شدم

جملہ دیگر بمریم از بشر تا بر آدم از ملائک بال و پر

۱۹۱۱ء سے مولانا کے روم علامہ اقبال کے نزدیک وحدت الوجود کا مظہر نہ رہے بلکہ تصوف اسلامی کا  
ایک پاکیزہ نمونہ بن گئے۔ وہ اقبال کے لئے مرشد راہ اور عشق جاودانی کا محرک بنے۔ اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں  
چھپی اور اس میں یہی نظریہ کار فرما ہے:

رومی خود بخود پیر حق سرشت کو بہ حروف پہلوی ستر آن نوشت

گفت ای دیوانہ ارباب عشق جرعی گیر از شراب ناب عشق

اسرار خودی کی رو سے جیسا کہ اشعار منقولہ میں مذکور ہے۔ اقبال نے مولانا کے روم کو خواب میں دیکھا اور

۲۷ محترمہ مقالہ نگار نے اقتباس کو پس و پیش کر دیا ہے۔ (مترجم)

۲۸ اقبال کے سلسلے میں یہ بات غالباً کسی اور نے نہیں لکھی ہے (مترجم)

ان کو پیرو مرشد مان لیا مولانا سے اظہار عشق و محبت اقبال کی ساری تصانیف میں جلوہ گر ہے۔ وہ اپنے مکاتیب میں دوستوں کو مثنوی کا مطالعہ کرنے کی بار بار سفارش کرتے ہیں۔ اقبال کی نظر میں مثنوی کا دقیق و عمیق مطالعہ فکر انسان کی معنوی تشکیلات و تعمیر میں مدد و معاون ہے۔

مولانا نے روم اقبال کا "خضر راہ" ہے۔ ہمارا عظیم معاصر شاعر اپنی ساری مشکلات کے حل کی خاطر مولانا سے روم سے رجوع کرتا ہے۔ وہ رومی سے سوال کرتا ہے اور اس کے اشعار کی روشنی میں جواب تلاش کرتا ہے۔ اقبال نے اپنی مثنویوں میں جابجا رومی کے برگزیدہ اشعار پر تفسیریں کی ہیں۔ اقبال نے اپنی بیشتر مثنویاں مثنوی شریف کی بحر اصل مسدس مقصور یا مخمذوف ہی میں لکھی ہیں۔ اس طرح مولانا کے اشعار کی تفسیریں ان کے لئے آسان ہیں۔ وہ ہمیشہ مولانا کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے ہیں۔

پیر رومی مرشد روشن ضمیر کاروان عشق دستار امیر  
منزلت برتر ز ماہ و آفتاب خمیرہ راز کھکشاں ساز دطناب

رومی اقبال کے لئے چراغِ راہ اور اسرار حیات کا شارح اور ترجمان ہے اس لئے کہ "نور قرآن در میان سینہ اش" روشن ہے مولانا کی بہترین توصیف اقبال نے "جاوید نامہ" میں کی ہے وہاں شاعر مولانا کی ایک غزل کو مترنم آواز میں پڑھ رہا ہے۔

دی شیخ با چراغِ ہی گشت گرد شہر کزدیو و دو ملولم و انسائم آرزوست

غزل خوانی کے بعد مولانا نے "وم کی" روح "ظاہر ہوتی ہے اور اقبال کو اسرار حیات، رموز زمان و مکاتیب نیز معراج سے آگاہ کرتی اور سیر افلاک کی خاطر اوپر لے آتی ہے اقبال فرماتے ہیں :-  
" فکر من بر آستانش در سجود "

اور یہ شعر بھی کتنا بر محل ہے :

نے آن نے نوازے پاک بازے مرا با عشق و مستی آشنا کرد

اقبال نے نئے کی رمز کو بہت استعمال کیا ہے اور اس کے مختلف معانی بیان کئے ہیں: نئے اپنی حسرت کے اظہار کی خاطر نغمہ سرائی کرتی ہے۔ حسرت و اشتیاق سے ہی اس کی فہیت بڑھ گئی ہے۔ انسان بھی حسرت کے عالم میں فعال تر ہو جاتا ہے :

جمال عشق گیرد از نئے او نصیب از جلال کبریا ئی

مولانا نے روم نے اپنی تصانیف میں جلال و جمال دونوں کا درس دیا ہے۔ ان کے ہاں عشق و کبریا کی ریں ہیں۔ اسی خاطر وہ لوگوں کے حقیقی راہبر ہیں۔ غیر کبریا سے عشق، غیر جلالی سے جمالی یا غیر جمالی سے اہل کا اظہار انسان کے روحانی اقتدار کی خاطر خطرناک ہے۔

اقبال کی شاعری میں اور واقعتاً بھی مولانا نے روم عقل کی افسردہ قوت کا مخالف ہے۔ وہ عشق سوزاں ہے۔ اقبال مولانا کو کہیں ابن سینا اور کہیں امام رازی سے مقابلہ کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔

”بوعلی“ اندر غبار نافتہ گم دستِ رومی پر دہِ محفل گرفت  
 اس فرود تر رفت تا گوہر رسید آں بہ گردانی چو خس منزل گرفت

اور: زوالِ عشق و مستی حرفِ رازیؒ

اقبال نے اپنے اشعار میں مغربی استاد گوٹے اور مشرقی راہنما رومی کو برابر حیثیت میں دکھایا ہے۔<sup>۲۸</sup>

”نیست پیغمبر و لے دارد کتاب“

”فاؤسٹ“ میں بھی مثنوی کی مانند انسانی ارتقاء اور عشق و حسرت کے لازوال اسرار درج ہیں۔

اقبال کا خیال تھا کہ مجھ کے لالہ زاروں سے کوئی اور رومی پیدا نہ ہوگا۔ اس لئے وہ اپنے کو اس بزرگ کا خلیفہ کہتے ہیں۔

نکتہ با از پیر روم آموختم خویشت را در حرف او داسوختم  
 شزار حبتہ امی گیر از درونم کہ من مانند رومی گرم خونم

اسی مناسبت سے اہل پاکستان اقبال کو ”رومی عصر کہتے اور اس ضمن میں کتابیں اور مقالے لکھے جاتے رہے ہیں۔<sup>۲۹</sup> اور اقبال پر رومی کے اثرات کی کیفیت لکھی جاتی رہی ہے۔ ہم جتنی بھی کوشش کریں، ان دو

<sup>۲۸</sup> ار مغان حجاز میں فرمایا ہے:

ز رازی حکمت قرآن بیاموز چراغی از چراغ او بیاموز  
 ولی اس نکتہ را از من مشراگیر کہ نتوان زیستن بی مستی و سوز (مترجم)

۲۹ پیام مشرق ص ۲۴۶ - مطبوعہ ۱۹۴۶ء : جلال و گوٹے

<sup>۳۰</sup> مقالہ نگار کی یہ رائے مبالغہ آمیز ہے (مترجم)۔<sup>۳۱</sup> مقالے تو بہت لکھے گئے مگر کتاب ”رومی عصر“ (فارسی) کے مؤلف ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی صاحب ہیں مطبوعہ تہران ۱۳۳۲ ہجری شمسی (مترجم)

بزرگوں کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ دونوں میں بڑی مشابہت ہے مگر اختلاف سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے ایک عدد سے کی مانند مولانا نے رومی کے دائمی عشق، حسرت، سوز و ساز اور مکمل انسان کی شعاعوں کو جذب کیا اور ان کی معنوی آتش سے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں کو گرمایا ہے۔ اس طرح مولانا نے اپنے پاکستانی مرید کے ذریعہ ایک (اسلامی) مملکت کے قیام میں مدد کی ہے اور یقیناً کئی سالوں میں مولانا کے کلام کی اتنی تاثیر اور کسی نے قبول نہیں کی ہے۔

ہاں جب بھی لوگ عشق الہی کی طرف متوجہ ہوں، جب بھی بنی آدم ظواہر سے ہٹ کر حقائق کی طرف جانا چاہیں، جب بھی عشق حبیبی سرمدی آگ میں جلنا چاہیں جو ان پر گلستان ثابت ہو، اس وقت مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی کے اشعار کی طرف ان کو رجوع کرنا ہوگا کیونکہ بقول رومی۔

کعبۃ العشاق باشد ایں مقام  
بہر کہ ناقص آمد ایں جا شد تمام

۳۰ مفسد یہ کہ مولانا کے کسی اور معنوی مرید کے انفاص سے نئی مملکت وجود میں نہ آسکی۔ فاضل مقالہ نگار کی یہ رائے لائق ستائش ہے۔ مگر افسوس کہ انہوں نے علامہ اقبال کی ان نتیجہ خیز مساعی کا ذکر نہ کیا جن کے ذریعے انہوں نے پیغام مولانا نے رومی کو ساری دنیا میں اور خصوصاً عالم اسلامی میں عام کیا ہے :

عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار باردا عجم رمیدہ بورا نغم بہار باردا

(اضافہ مترجم)

